ان جگہوں پر سرکاری پہرہ لگا رہتا ہے۔ کبھی جواہرات کانوں سے بھی نکالے جاتے ہیں، یہ پتھروں کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں، پتھر کو توڑ کر جوہر الگ کر لیا جاتا ہے۔ لنکا کا راجہ دین و شریعت کا پابند ہے، اس کے دربار سے مذہبی عالم وابستہ ہیں، ان کے حلقے اور جلسے ہوتے ہیں جس طرح ہمارے محدثوں کے تعلیمی حلقے ہوتے ہیں، ان حلقوں میں ہندوستانی ہندو شرکت کرتے ہیں اور مذہبی عالموں سے اپنے اوتاروں کے حالات زندگی اور مذہبی قاعدے ضابطے دریافت کر کے قلمبند کرتے ہیں۔ یہاں خالص سونے کی ایک بڑی مورتی ہے جس کا وزن سمندری مسافر بہت زیادہ بتاتے ہیں، اور ایسے تبخانے (ہیا کل) بھی جس پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی گئی ہیں، یہاں بہت سے یہودی بلکہ ہر مذہب و ملت کے لوگ آباد ہیں، راجہ کی طرف سے ہر مذہبی اقلیت کو اپنی شریعت اور روایات پر عمل کرنے کی آزادی ہے،

ابن الفقیہ ہمدانی[1] (نویں صدی کا ربع آخر) :-

بحر بنگال (ہرکند) میں لنکا کا جزیرہ واقع ہے، یہاں وہ پہاڑ ہے جس پر آدم اتارے گئے تھے، پہاڑ پر ان کے پیر کا نشان موجود ہے، یہ پہاڑ لمبا اور بڑا ہے اور اس میں مختلف قسم کے مسالے اور خوشبودار پودے اور مشکی چوہے پائے جاتے ہیں۔ پہاڑ سے متصل سمندر میں موتیوں کے ذخیرے ہیں، اس جزیرہ میں تین راجہ راج کرتے ہیں، جب سب سے بڑا راجہ مرتا ہے تو اس کے چار ٹکڑے کئے جاتے ہیں اور انکو آگ میں جلا دیا جاتا ہے، اسکے فدائیوں کی جماعت اسکے پیچھے پیچھے آگ میں کود پڑتی ہے اور جل مرتی ہے۔ ۴

ابن رستہ[2] (دسویں صدی کا ربع اول)

بحر ہند میں آباد اور غیر آباد جزیروں کی تعداد تیرہ سو ستر ہے، ان میں سے ایک بڑا جزیرہ ہندوستان کے جنوبی سرے کے بالمقابل طبر وبانی[3] (لنکا) ہے، اس کا دور تین ہزار میل[4] ہے۔

---

[1] مختصر کتاب البلدان صفحہ ۱ [2] الاعلاق النفیسہ صفحہ ۸۴ [3] طبروبانی سنسکرت کے تمراپنی یا تمراپانی کی تعریب ہے۔ تمراپنی کے معنی ہیں لال پتے والا اور تمراپانی بڑے تالاب کو کہتے ہیں۔ دیکھو کننگھم صفحہ ۲۳۸ [4] یہ رائے سنی سنائی معلومات پر مبنی ہے اور حقیقت سے بہت دور۔ لنکا کا صحیح دور صرف چھ سو پچاس میل ہے۔ یعنی ابن رستہ کے دور سے تقریباً ۱/۵ حصہ کم۔ دیکھو کننگھم صفحہ ۶۳

یہاں بڑے بڑے پہاڑ اور بہت سے دریا ہیں اور ان سے لال و آسمانی یاقوت نکلتے ہیں، اس جزیرہ کے آس پاس اَنیل[ف] آباد جزیرے ہیں جن میں شہر اور بہت سے دیہات پائے جاتے

بزرگ بن شہریار[۱] (دسویں صدی کا ربع ثالث) :-

اُن جزیروں میں جن کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور جن کی نظیر نہیں ملتی لنکا کا جزیرہ ہے، اس کا نام سَیلان (سہیلان)[۲] ہے، اس کی لمبائی تین سو میل (تقریباً سو فرسخ) ہے اور دور تقریباً سوا نو سو میل (تین سو فرسخ) ہے، یہاں کے سمندر سے صاف چھوٹے موتی نکالے جاتے ہیں، یہاں کا بڑا موتی اچھا نہیں ہوتا، لنکا کا پہاڑ دشوار گذار ہے، اس میں یاقوت اور الماس پایا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر آدم علیہ السّلام اترے تھے اور اس پر اُن کے قدم کا نشان ہے، قدم کی لمبائی تقریباً ایک سو پانچ فٹ (ستر ذراع) ہے، لنکا کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ آدم کا نقشِ پا ہے، انھوں نے ایک قدم پہاڑ پر رکھا تھا اور دوسرا سمندر میں۔ لنکا میں سُنبا ذَج نامی لال مٹی ہوتی ہے جس سے بلور اور شیشہ تراشا جاتا ہے، یہاں کے (بعض) درختوں کی چھال سے اعلیٰ قسم کی دارچینی (قرفہ) حاصل ہوتی ہے جو قرفہ سَیلانیہ (سہلانیہ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس جزیرہ کی گھانس لال ہوتی ہے جس سے کپڑا اور رسوت رنگا جاتا ہے، اس گھانس کا رنگ بقم[۳] زعفران[۴] عصفر بلکہ ہر قسم کے لال رنگ سے اچھا ہوتا ہے۔ لنکا میں اور بھی انوکھی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے دیہاتوں کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔

---

۱ عجائب الہند ص۱۵۹-۱۸۰۔ ۲ عربی تحریروں میں لنکا کے لیے زیادہ تر سرندیپ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن بعض کتابوں میں سیلان بالتحریک بھی قلمبند ہوا ہے، یہی سیلان انگریزی میں سیلون ہو گیا ہے۔ سَیلان شاید سنہالا کی بگڑی ہوئی شکل ہے، پالی زبان میں لنکا کو سنہالا دیپ کے نام سے یاد کیا گیا ہے، متن کا سہیلان بظاہر سیلان کی تصحیف معلوم ہوتی ہے۔ ۳ ایک درخت جس کے لال پتوں سے کپڑے رنگے جاتے تھے۔ ۴ زعفران اور عصفر دونوں پیلے رنگ ہیں اس لیے لال رنگ والی گھانس کا ان سے مقابلہ بے محل معلوم ہوتا ہے۔

⁂

(قسط ۲)

قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تمدنی جھلکیاں

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ال ال بی
سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

---

(۳) خلجی عہد حکومت

سلطان علاء الدین خلجی نے تخت نشین ہونے پر حوض خاص کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا، جس کی بعد میں فیروز تغلق نے مرمت کرائی تھی[۱] حلائی دروازے پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس میں علاء الدین خلجی کو "علم اور دین کی محرابوں کا حامی و ناصر اور مدارس و معابد کے قوانین و قواعد کا قوت دینے والا" بتایا گیا ہے۔ اس کا وزیر اعظم شمس الملک خود صاحب علم و فضل تھا جس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک استاد ہی کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس نے شیخ نظام الدین جیسے صوفی باصفا کو تعلیم دی تھی[۲] اور سرکاری ذمہ داریوں کے باوجود بعد میں بھی اہل علم کی سرپرستی

---

[۱] چنانچہ سلطان فیروز تغلق نے جن قدیم عمارتوں کی مرمت کا تذکرہ "فتوحات فیروز شاہی" میں کیا ہے ان کے اندر سلطان علاء الدین خلجی کا مقبرہ بھی تھا۔ اس سے ملحق مدرسہ میں اس نے اس کی مغربی دیوار اور فرش کی بھی مرمت کرائی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے

"و مقبرہ سلطان علاء الدین را مرمت نمودہ ...... و دیوار غربی مسجدے کہ دردن مدرسہ است و فرش تا شیب مرمت کردہ شد"۔ (فتوحات فیروز شاہی صفحہ ۱۶)

[۲] فرمود کہ خواجہ شمس الملک علیہ الرحمہ را رسمے بود، اگر شاگردے ناغہ کردے یا دو سہ بعد از دیر بما آمدے بگفتے کہ چہ کردہ ام کہ نمی آئی۔ بعد ازاں تبسم فرمود و گفت اگر با کسے مطایبہ کردے ہم چنیں سخن گفتے کہ چہ کردہ ام کہ نمی آئی تا بیہان کنم۔ بعد ازاں فرمود کہ مرا اگر ناغہ شدے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کرتا رہا۔

(۵) تغلقوں کا عہد حکومت

محمد تغلق نے ۷۳۱ھ میں شہر دہلی کے اندر ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ساتھ ایک مسجد بھی ملحق تھی مشہور شاعر بدر چاچ نے اس موقع پر جو قطعہ کہا تھا، اُس کے کچھ اشعار کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"اس مسرور و شاداں عمارت اور اس مبارک تعمیر کو دیکھنے کے لیے چرخ نے آئینہ کی طرح ہزاروں آنکھیں کھول رکھی ہیں، اس کا صحن بہشت کے تصویر محل کا نقش طراز ہے اور اس کی ہوا سے نسیم باد بہار کی غالیہ خوشبو کمیرتی ہے، اس کی بارگاہ کے ستون کے ایک سرے کی فضا میں سات گھومنے والے قلعوں کے نو میدان گھرے ہوئے ہیں، اُس کے رکنوں کے چار بازوؤں نے خوش بختی کی اعانت کے ساتھ سر عرش کو بھی آغوش میں لے لیا ہے، اُس کا بیرونی حصہ شکروں کے جوش سے پر خروش ہے اور اُس کا اندرونی حصہ ذکر و استغفار کی وجہ سے مصفا ہے۔ اس کے مدرسہ کا صدر اپنے علم و فضل کی بنا پر حضرت ادریس علیہ السلام کا بھی اُستاد ہے اور اُس کی مسجد کا امام اپنی خوش الحانی کی بنا پر طوطی شکر گفتار ہے"

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) یا بعد از دیرے برفتے، در خاطر گذشتے کہ با من ہم چیزے خواہد گفت۔ با من ایں بگفتہ

آخر کم از اکگاہ گاہے آں دیا کن نگاہے

..... یکے از حاضران گفت کہ من ایں چنیں شنیدم کہ دراں ایام کہ شما بخدمت شمس الملک می رفتید، او بخدمت شما تعظیم کردے۔ و در حجرہ کہ مقام خاص آں بودے شما راآں جا جائے کردے، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ آرے دراں حجرہ کہ او نشستے ہیچ کس نہ نشستے مگر قاضی فخر الدین ناقلہ یا مولانا برہان الدین۔ باقی مراہم آنجا بگفتے کہ بنشیں۔ من گفتمے کہ آنجا جائے شما است معذور نداشتے۔ البتہ مراہم جائے کردے یکے از حاضراں بپرسید کہ او وقتے لطفے داشت، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ آرے او وقتے مستوفی شدہ بود، خواجہ تاج ریزہ درباب او ایں بیت گفتہ است:۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

وہ ادخلوا فیہا کی تاریخ (۷۵۳ھ) میں مکمل ہوا۔ میں تجھ سے صاف صاف کہوں کہ
۷۵۳ھ میں اس کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔[۱]

فیروز تغلق کے زمانہ میں اعلیٰ تعلیم کے اندر بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ وہ علم و ادب کا بڑا یدائی تھا اور علمار کا سرپرست۔ سلطنت کے مختلف حصّوں میں ۳۰ مدرسے تعمیر کر کے اُن پر بیہات وقف کیے[۲] ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر مدرسہ فیروز شاہی تھا جو حوض خاص ردا قع تھا۔ برنی نے بڑی تفصیل سے اس کا بیان کیا ہے۔ یہ بڑے عمدہ باغوں کے اندر اقع تھا اور اس میں اساتذہ اور دیگر علمار کے لیے اقامت گاہیں بنی ہوئی تھیں اس سے ق ایک مسجد اور مقبرہ بھی تھا۔ غیر ملکی سیاح جب دہلی آتے تو اس مدرسہ کو دیکھتے اور اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

شمسا کنوں بکام دل دوستاں شدی مستوفی ممالک ہندوستاں شدی

مدہ عرضداشت کرد کہ بزرگی خواجہ شمس الملک و وفور علم ایشاں معلوم ہست۔ دا کہ داند کہ بادرویشاں مدے داشتے یا محبتے با ایشاں۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ عقیدۂ خوب داشت۔ اینکہ مرا تعظیم اشتے، دلیل خوب اعتقاد او بود۔" (فوائد الفواد صفحہ ۶۷۔ ۶۸)

---

[۱] بریں عمارت خرم بریں خجستہ سرائے — ہزار دیدہ کشادہ است چرخ آئینہ دار
خفاش نقش طراز نگار خانۂ خلد — ہواش غالیہ سائے نسیم باد بہار
فضائے عرصہ یکسر ستون بارگہش — محیط نہ زنہ، ہفت قلعہ دوار
چہار بازو ارکان او بہ پشتی بخت — ز روئے لطف سر عرش را گرفتہ کنار
بیرون روز حلاپر خروش جوش جیوش — درون او ز صفاہائے ذکر و استغفار
رئیس مدرسہ او معلم ادریس — امام مسجد او طوطی شکر گفتار
. . . .
تمام گشت بتاریخ ادخلوا فیہا — کشادہ با تو بگویم کہ ہفصد و چل و چہار

[۲] و آنچہ از بنا ہا کے عمارات و بقاع خیر ادیافتہ شدہ بایں شرح است ...... مدرسہ ۳۰ عدد ... دار الشفا ام عدد ...... و بر ہر یک از عمارات وقف نامہا نوشتہ و موقوفات تعیین ساختہ و اہل خدمت بجمیع مساجد و مدارس ... معین ساختہ و وظیفہ قرار دادہ "طبقات اکبری مطبوعہ کشور صفحہ ۱۲۱)

نفاست تعمیر کی تعریف کرتا نہ بھولتے۔ فیروز شاہ نے مولانا جلال الدین رومی کو اس مدرسہ کا صدر مقرر کیا تھا۔[1]

ایک دوسرا مدرسہ سلطان فیروز تغلق نے سیری کے مقام پر قائم کیا تھا۔ یہ بھی ایک شاندار عمارت میں واقع تھا، جو ایک خوبصورت مقام پر واقع تھی۔[2] اسی طرح کے مدرسے

---

[1] دوم از بناہائے مبارک خداوند عالم مدرسہ فیروز شاہی است کہ بس بوالعجب عمارتے بر سر حوض علائی بنا شدہ است و عمارت مدرسہ مذکور از رفعت گنبد ہا و شیرینی عمارتہا و موازین صحنہا و لطافت نشست جاہا و محلہا ئے مروح و صفہائے دلآویز گوئے لطافت از عمارتہا ئے کہ در عالم است ربودہ است و عجب عمارتے و بوالعجب بناستے کہ ہر کہ از مقیمان و مسافران در مدرسہ فیروز شاہی در می آید، ہم چنیں تصور می کند کہ مگر در بہشت در آمدہ یا در فردوس اعلیٰ جائے یافتہ ..... و مولانا جلال الدین رومی کہ بس استادے متفنن است دائما در منصب افادت سبق علوم دینی می گوید (تاریخ فیروز شاہی برنی صفحہ ۵۶۲ - ۵۶۴)

اسی طرح اس عہد کا ایک مشہور شاعر مطہر اس مدرسہ کی تعریف میں لکھتا ہے

گفتم ایں مدرسہ و باغ شہنشاہ جہاں است اندروں آئی کہ یک حسن بہ بینی بہزار
چوں در آمد ز درش دید دراں جنت خلد فاضلاں صف زدہ ہر سوئے ملائک کردار
عالمان عربی لفظ و عراقی دانش ہمہ در جبہ شامی و بمصری دستار
ہر یکے نادرۂ دہر در انواع ہنر ہر یکے واسطۂ عقل در اطراف دیار
صدر آں محفل و سر دفتر آں استادے کز سر تا بقدم صورت عقل است و وقار
گفتم ایں عالم آفاق جلال الدین است رومی آں کز نسبش سکندر و روم فخار
راوی ہفت قرأت سند چار دہ علم شارح فخ سنن مفتی مذہب ہر چار
پس شنیدم ز گفتارش انواع علوم اخذ کردیم ز تفسیر و اصول و اخبار
ہم چناں یکدگر از طالب علماں ہر سوئے بر فلک بردہ صدا غلغلش بحث و تکرار
ساختہ چوں شغب و شور و جدل ساکن شد اندر آورد ز در خوانیش خوان سالار

[2] "و سوم بنائے مبارک سلطان فیروز شاہی در دار الملک دہلی ہمیں عمارت ہا ہند سیری است کہ ہوا ئے خوش او حکایت ز ہوا ئے جنات عدن می کند ..... و دریں ایام در انجا از عواطف (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس نے فیروز آباد اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں قائم کئے تھے اور ان کے مصارف کے لیے بڑے بڑے اوقاف وقف کئے تھے۔ "صبح الاعشیٰ" کے مصنف القلقشندی کے قول کے مطابق صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدرسے اور ستر شفاخانے تھے۔ ان ایک ہزار مدارس میں سے صرف ایک مدرسہ شوافع کا تھا۔ باقی احناف کے تھے[1] ("صبح الاعشیٰ" اسی زمانے کی تصنیف ہے)

فیروز تغلق نے قدیم مدارس کے اخراجات کے لیے نئے نئے اوقاف کئے اور پہلے اوقاف کی تجدید کی[2]۔ اہل علم کی مدد معاش کے طور پر خصوصی عطایا دی جاتی تھیں اور غریب طلباء کے وظائف مقرر تھے، تاکہ وہ بغیر کسی مالی دقت کے اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔

سلطان محمد تغلق نے شاہی دربار نیز مختلف محکموں کی ضروریات کے لیے مطلوبہ سامان مہیا کرنے کے واسطے متعدد کارخانے قائم کئے تھے۔ فیروز تغلق نے ان کارخانوں کو صنعتی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) بادشاہ اسلام در دہلی معظم بنا شدہ است و مولانا وسید الائمہ و العلماء نجم الملة والدین سمرقندی راکہ از نوادر اساتذہ مستند در آں عمارت مبارک مدرس گشتہ (تاریخ فیروز شاہی برنی صفحہ ۵۶۲)

---

[1] مدینہ دلی ...... قال الشیخ مبارک ..... وفیہا الف مدرسۃ منہا مدرسۃ واحدۃ للشافعیۃ وباقیہا للحنفیۃ (الصبح الاعشیٰ الجزء الخامس صفحہ ۶۸-۶۹)

[2] دیگر از مواہب الٰہی یکے آن ست کہ عمارات و بناہائے گزشتگان و سلاطین قدیم و امرائے ماضیہ .... بہ مرمت و عمارت مجدد بیاراستیم ...... ہم چنیں مدرسہ سلطان شمس الدنیا والدین التمش رضی اللہ عنہ را کہ بناہائے کہ انہدام پذیرفتہ بود، عمارت کردہ و در از چوب صندل بنادیم .... و مقبرہ سلطان علاء الدین را مرمت نمودہ ..... دیوار غربی مسجد کہ درون مدرسہ است و فرش ستاشیب مرمت کردہ شد .... مصالح ایں مرمت و عمارات ایں مقابر و مدارس از اوقاف قدیم ایشاں مستقیم داشتہ شد، و در جائے کہ پیش ازیں وجہے معین نہ بود برائے صادر و وارد فرش و روشنائی کہ درخور آں مقام باشد، و دیہہا معین کردہ شد ..... مصالح ایں مرمت و مدام آنجا خرچ شود" (فتوحات فیروز شاہی صفحہ ۱۴-۱۵)

تعلیم کی درسگاہوں میں بدل دیا۔ جنگی قیدی ان کارخانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے، جہاں انہیں مختلف قسم کی دستکاریاں سکھائی جاتی تھیں تاکہ وہ مستقل کاریگری کی حیثیت سے اپنا کاروبار شروع کر سکیں اور اس طرح ایک مفید اور وفادار شہری بن سکیں۔ ایک مرتبہ اس قسم کے بارہ ہزار جنگی قیدی ان کارخانوں میں زیرِ تربیت تھے۔[1]

(۶) لودیوں کے عہد میں علمی سرپرستی کی تجدید

التمش کے زمانے سے سکندر لودی کے عہد تک مدارس کا نصاب ایک مقررہ نہج کا ہوتا تھا زیادہ زور مذہبی علوم (منقولات) پر دیا جاتا تھا۔ برنی کی تصریح کے مطابق جو ایک ہمعصر مورخ ہے، دہلی کے مدرسہ فیروز شاہی میں جن مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی، وہ تفسیر، حدیث اور فقہ تھے[2]، معقولات میں "شرح شمسیہ" اور "شرح صحائف" نصاب میں داخل تھیں۔[3]

---

[1] شاہ فیروز را بتقدیر اللہ برائے جمع کردن بندگان ہوا خواہ اہتمام بسیار و کوشش بے شمار در دل افتاد.... بر جملہ مقطعان اقطاعات و کل عہدہ داراں احسن صفات تاکید بر تاکید شدہ ہر محلے کہ شب کنند باید کہ بندگان بچینند۔ آنچہ لائق درگاہ و شایستہ بارگاہ بادشاہ باشند بحضرت سامی رسانند.... جملہ مقطعان چوں در حضرت خسرو جہان می آمدند، ہر یکے بر اندازہ دستگاہ خویش از آثار رغبت شہریار بندگان چیدہ و خوبصورت را اصیل را جامہائے پاکیزہ پوشانیدہ.... خدمتے پیش تخت شاہی گزرانیدند.... چوں حضرت شاہ را معاینہ شد کہ بندگان بسیار جمع شدند.... در ہر اقطاعے برائے سکونت فرستاد.... و دیگر بندگان کہ در شہر بودند ہر یکے را مشاہرہ کامل تعیین کردہ.... نقد بے قصور و نقصان از خزانہ موفورہ می یافتند۔ بعضے در کلام اللہ و حفظ و بعضے در علوم دینی و بعضے در قسم تحریر مشغول شدند و بعضے در خانۂ کعبہ بحکم فرمان رفتند و بعضے را تسلیم طوائف کردند۔ ایشان صنعت و حرفت آموختند۔ موازنہ دوازدہ ہزار نفر بندگان کاسب ہر جنس شدند۔ (تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف صفحہ ۲۶۷-۲۷۰) [2] "دوم از بناہائے مبارک خداوند عالم مدرسہ فیروز شاہی است.... مشتغل اند و ما بمواره تعلیمی کنند و تفسیر و حدیث و فقہ می خوانند" (تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی صفحہ ۵۶۲-۵۶۳) [3] "در زمان سکندر شیخ عبداللہ طلبنی..... و شیخ عزیز اللہ طلبنی.... بہندوستان آمدہ علم معقول را در اں دیار رواج دادہ و قبل ازاں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نبود" (منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۳۲۳-۳۲۴)

ان علوم کے علاوہ نحو، ادب، منطق، تصوف اور علم کلام بھی پڑھائے جاتے تھے۔

جب سکندر لودی نے ۱۵۰۴ء میں شہر آگرہ کی بنیاد ڈالی اور وہاں اقامت شروع کی تاکہ قرب و جوار (بالخصوص کول، اٹاوہ اور گوالیر) کے شورش پسند امرا پر زیادہ موثر طور پر نظر رکھ سکے تو نئے شہر کی علمی سرپرستیوں میں بھی خاصی توجہ ہوئی سکندر خود ایک شاعر و ادیب تھا[1] لہٰذا اس نے ملک کے تمام حصوں میں مدرسے قائم کئے اور بڑے بڑے دور دراز علاقوں سے باکمال اساتذہ کو بلایا[2] تاکہ وہ ان مدرسوں کی، جنھیں اس نے آگرہ اور دوسرے مقامات پر قائم کیا تھا صدارت قبول فرمائیں۔ اس نے اپنے فوجی افسروں کی لازمی تعلیم پر بھی زور دیا[3]۔ حسب تصریح شیخ عبدالحق محدث دہلوی سکندر لودی نے عرب، ایران اور وسط ایشیا میں اہل علم کو یہاں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے کیلئے بلایا۔ بہت سے اہل علم بغیر بلائے تشریف لائے اور ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا۔ سکندر لودی نے متھرا اور نرور میں مدارس قائم کئے جو بغیر کسی ذات پات اور عقیدے کے امتیاز کے سبھوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔

ان علماء میں جنھیں سکندر لودی نے بلایا تھا، دو بھائی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ

---

[1] "و پادشاہ سکندر طبع موزوں داشت۔ شعر متین گفتے و گلرخی تخلص کردے شیخ جمالی کنبوہ از مصاحبان و ہمدمان او بود...... و کتاب فرہنگ سکندری و دیگر کتب در عہد او بسیار نوشتہ شدہ" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۸۰)　[2] "چوں بادشاہ را با استماع مذاکرۂ علمی رغبتے تمام بود علمائے نامی را از اطراف طلبیدہ مجلس بحث ترتیب دادہ و تفصیل اسامی آنہا ایں ست: میاں قادر بن شیخ خواجو و میاں عبداللہ بن الہ داد از طلبنہ و سید محمد بن سعید خان از دہلی و ملا قطب الدین و ملا الہ داد صالح از سرہند و سید برہان و سید احسن از قنوج آمدند۔ جمعے از آمرا کہ ہمیشہ ہمراہ بادشاہ می بودند مثل صدر الدین قنوجی و میاں عبدالرحمن ساکن سیکری و میاں عزیز اللہ سنبھلی۔ ایشاں نیز درآں معرکہ حاضر شدندے" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۸۲)

[3] "و بعہد فرخندہ او علم رواج یافت و امرا و ارکان دولت و سپاہیان بکسب فضائل اشتغال نمودند"۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۸۷)

بھی تھے، جو ملتان سے آئے تھے۔ یہ دونوں علوم معقولات کے خصوصی ماہر تھے[1] شیخ عزیز اللہ کو سنبھل کے مدرسہ کی صدارت دی گئی اور شیخ عبداللہ دارالسلطنت دہلی ہی میں رہنے لگے۔ سکندر لودی شیخ عبداللہ کے طریق تدریس کا اس درجہ عقیدت مند اور مشتاق تھا کہ جب بھی اسے مملکتی ذمہ داریوں کی انجام دہی سے فرصت مل جاتی، وہ ان کے درس میں ضرور شریک ہوتا۔[2] شیخ عبداللہ کے نفسِ گرم ہی کی تاثیر تھی کہ اُس سے دارالسلطنت شہر دہلی میں معقولات کی اتنی گرم بازاری ہوئی۔ اُن کے حلقۂ درس سے چالیس شاگرد ایسے نکلے جو معقولات میں خصوصی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان میں میاں لاڈن، جمال خاں دہلوی میاں شیخ گوالیری اور میاں سید جلال بدایونی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں[3]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سکندر لودی ہی کے زمانہ میں ہندو بالخصوص کایستھ فارسی زبان وادب کی طرف متوجہ ہوئے[4] اور کچھ ہی زمانہ گزرا تھا کہ وہ لوگ اس زبان میں

[1] چنانچہ بدایونی نے لکھا ہے (منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۳۲۳)
"واز جملہ علمائے کبار در زمان سکندر شیخ عبداللہ طلبنی در دہلی و شیخ عزیز اللہ طلبنی در سنبل بودند و ایں ہر دو عزیز ہنگام خرابی ملتان ہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند"
ان کی تقلید میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں (مآثر الکرام صفحہ ۱۹۱)
مولانا عبداللہ طلبنی .... پیشرو علما، است و قافلہ سالار فضلا، مستجمع معقول و منقول و متکمل فروع و اصول عمرہا در وطن مالوف بر چارِ بالش افادہ نشست و شش جہت را بہ نشر لوامع علوم منور ساخت۔ آخر الامر از خرابی ملتان او و شیخ عزیز اللہ طلبنی رخت رحلت بدارالخلافہ دہلی کشیدند و علم معقول را دراں دیار مروج ساختند" [2] می گویند کہ سلطان سکندر رونق درس شیخ عبداللہ بخود می آمد و بتقریبے اینکہ مبادا اخلال در سبق طلبہ افتد پنہاں در گوشۂ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیک گفتہ بایکدیگر صحبت می داشتند" (منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۳۲۴) [3] "واز اساتذہ شنیدہ شد کہ زیادہ از چہل عالم تحریر متبحر از پائے دامن شیخ عبداللہ مثل میاں لاڈن و جمال خاں دہلوی و میاں شیخ لودی و میراں سید جلال بدایونی و دیگراں برخاستہ بودند" (منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۳۲۴) [4] "و کافراں بخواندن و نوشتن خط فارسی کہ تا آں زمان در میان ایشاں معمول نبود شروع نمودند" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ...)

اتنے مشاق اور واقف کار ہوگئے جتنے خود مسلمان۔ اس کے بعد وہ سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے لگے۔ بعد کی صدیوں میں ان کے اندر بڑے بڑے ادباء و شعراء پیدا ہوئے۔

(۷) تیمور کے حملہ کے بعد طوائف الملوکی

تیمور کے حملہ (۱۳۹۸ء) کے بعد بہت سے باکمال اہل علم صوبائی دارالحکومت میں چلے گئے[1] جہاں مقامی علمی و ثقافتی روایات قائم ہو چکی تھیں۔ یہاں سینکڑوں مدرسے چل رہے تھے جونپور ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا جہاں دور و نزدیک سے طالب علم کھنچے چلے آ رہے تھے۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے فیاض عہد حکومت میں اس نے "شیراز ہند" کا نام حاصل کر لیا تھا[2] اس کے زمانہ میں جونپور کا دربار دہلی کے دربار سے بھی گوئے سبقت لے گیا تھا اور مشرق کے صاحبان فضل و کمال کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا[3] بی بی راجہ بیگم کا مدرسہ جونپور کی سب سے مشہور درسگاہ تھا

---

[1] فیروز تغلق کی وفات، اور تیمور کے حملے نے ملک کی سالمیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ دکن کی بہمنی حکومت (۱۳۴۷ء۔ ۹۳۴ھ) محمد تغلق ہی کے زمانہ میں قائم ہو چکی تھی۔ جونپور کی حکومت کا آغاز ۱۳۹۴ء میں ہوا اور پھر کچھ دنوں بعد شرقی خاندان نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہ خاندان ۱۴۷۹ء تک حکمراں رہا۔ مالوہ اور مندو کی مستقل حکومت ۱۴۰۱ء میں قائم ہوئی اور ۱۵۳۱ء تک باقی رہی۔ گجرات کی سلطنت ۱۴۰۱ء سے ۱۵۷۲ء تک برقرار رہی۔ ان کے علاوہ خاندیش، بنگال، سندھ ملتان اور مالابار میں بھی مقامی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ مگر اس طوائف الملوکی سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ہر سلطنت اپنی اپنی جگہ علم و ادب کی سرپرستی کے لیے کوشاں تھی۔ اہل کمال دہلی کی بربادی کے بعد قدردانی کی تلاش میں صوبائی حکومتوں ہی میں پہنچے تفصیل آگے آ رہی ہے (مترجم) [2] "علماء و بزرگان کہ از آشوب جہاں پریشان خاطر بودند، بجونپور کہ دراں ایام دارالامان بود، سر برآوردند۔ وآں دارالسلطنت از فر قدوم علماء دارالعلم گردید و چندیں کتب و رسائل بنام او تصنیف شد، مثل حاشیہ ہندی و بحر مواج و فتاوائے ابراہیم شاہی و ارشاد و غیر ذلک۔" (طبقات اکبری صفحہ)

اسی طرح فرشتہ ابراہیم شاہ شرقی کی علماء نوازی کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"در عصر وے فضلائے ممالک ہندوستان و دانشمندان ایران و توران کہ از آشوب جہاں پریشان خاطر بودند، بدارالامان جونپور آمدہ، در مہد امن و امان غنودند (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اور یہاں سے بڑے بڑے اہل علم نکلے ہیں۔ شیر شاہ سوری نے جونپور ہی میں تعلیم پائی تھی[1] جہاں اس نے دینی علوم کے ساتھ تاریخ اور فلسفہ بھی پڑھا تھا۔ بعد میں اُس نے نارنول کے اندر ایک مدرسہ قائم کیا جو علم و ادب کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ وہاں مدارس جونپور ہی کے نصاب کا تتبع کیا جاتا تھا۔

بنگال، بہار، گجرات، مالوہ، خاندیش اور دکن میں بھی علم و ادب کی بڑی گرم بازاری تھی۔ سلطان محمود شاہ بہمنی علم اور علمار کا بڑا سرپرست تھا۔ ہر جگہ سے فضلار نامدار جوق درجوق اُس کے دارالحکومت میں چلے آرہے تھے۔ اس نے گلبرگہ، بیدر، ایلچپور، دولت آباد، دبیل اور جینر میں یتیموں کی تعلیم کے لیے خصوصی مدارس قائم کئے تھے[2]۔ مشہور بہمنی وزیر محمود گاوان نے اپنے صرف خاص سے بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) دار خوانِ احسان او زلہا برداشتہ بنام نامی او چنانچہ بزبان قلم خواہد آمد چندیں کتب و رسائل پرداختند..... مردم از اطراف و اکناف ہندوستان کہ مشحون از خلق شدہ بود، روئے بجونپور آوردہ، ہر یک فراخور مرتبت و حالت نوازش یافت۔ و ازدحام مشائخ و علمار و سادات و نبیرہ از ہر حیثیت بجائے رسید کہ جونپور را دہلی ثانی می گفتند۔" (تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۰۵ - ۳۰۷)

[1] (فرید شیر شاہ) "گفت کہ جونپور نسبت بہ سہسرام شہر است و اینجا علمار بیشتر اند۔ ہمیں جا بطالب علمی مشغول می شوم۔ بعد ازاں آنجا بودہ، چیزے می خواند و کافیہ را با دیگر حواشی و کتب خواند و گلستاں و بوستاں و سکندر نامہ کہ دراں زماں اہل ہندمی خواندند، نیز گزیدہ (طبقات اکبری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۲۳)

[2] "و از برائے یتیماں در گلبرگہ و بیدر و قندھار و ایلچپور و دولت آباد و جینر و چیول و دیگر شہرہا و قصبہ ہائے بزرگ معلماں نشاندہ، اخراجات معین کرد۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۴)

یتامیٰ کی تعلیم کے علاوہ اس نے حدیث کی ترویج و اشاعت پر بھی زور دیا، چنانچہ فرشتہ اس کے حال میں لکھتا ہے:-

" و جہت محدثان اخبار حضرت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم در شہرہا کے کلاں وظائف مقرر کردہ در تعظیم ایشاں می کوشید۔" (ایضاً صفحہ ۳۰۲)

[۱] اس کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ محمود گاواں نے ایران کے مشہور شاعر اور عالم مولانا عبدالرحمٰن جامی کو دعوت دی تھی کہ وہ آکر اس مدرسہ کی صدارت قبول فرمائیں۔ لیکن انھوں نے پیرانہ سالی کی وجہ سے اس خدمت کی انجام دہی سے معذرت کرلی تب اس کی نگہ انتخاب شیخ ابراہیم ملتانی پر پڑی جو ایک مشہور فاضل اور صوفی عالم تھے۔ ان کی نگرانی میں مدرسہ نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کی (یہ بلند مدرسہ جس کی تعمیر قابل ستائش ہے، ارباب صدق وصفا کا قبلہ ہے۔ بارگاہ خداوندی میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی تاریخ آیت قرآنی "ربنا تقبل منا" سے نکلتی ہے[۲])

(۸) مغل خاندان کا آغاز۔ بابر اور ہمایوں

مغلوں کے ہندوستان فتح کرنے کے بعد ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کی بشمول تعلیم وتدریس بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ بابر اور ہمایوں دونوں بڑا اعلیٰ علمی مذاق رکھتے تھے[۳] موخرالذکر تو

---

[۱] آثار جمیلہ وحمیدہ آں خواجۂ آصف شعار در زمین فتنہ خیز دکن بسیار است۔ خصوصاً مدرسہ کہ معمار ہمت او پیش از شہادت بدو سال در بلدہ خیر اثر بیدر با تمام رسانیدہ و از حسن قبول "ربنا تقبل منا" تاریخش گشتہ۔ چنانکہ گفتہ۔ قطعہ

این مدرسہ رفیع محمود بنا — چوں کعبہ شدہ است قبلۂ اہل صفا
آثار قبول بیں کہ شد تاریخش — از آیت ربنا تقبل منا

و تا زمان تحریر ایں حکایت کہ سنہ ۱۰۲۳ ثلاث وعشرین والف باشد، آں عمارت و مسجد و چاہ طاق بازار بزرگ باقی است۔ و از لطافت و پاکیزگی چناں در نظر می آید کہ حالا بنّایاں دست از تعمیر باز داشتہ اند" (تاریخ فرشتہ جلد اول، صفحہ ۳۵۰) [۲] آیت کریمہ "ربنا تقبل منا" کے اعداد بحساب جمل ۸۷۷ھ ہوتے ہیں (۸۷۷ھ ۱۴۷۲ء کے مطابق تھا) [۳] ابوالفضل بابر کے بارے میں لکھتا ہے "ذات آنحضرت را در نظم ونثر پایۂ عالی بود خصوصاً در نظم ترکی و دیوان ترکی آں حضرت در نہایت فصاحت و عذوبت واقع شدہ و مضامین تازہ در آں مندرج است و کتاب مثنوی کہ مبین نام وارد تصنیفے است مشہور و نزد زبان دانان ایں لغت بمزید تحسین مذکور و رسالہ والدیہ خواجہ احرار کہ دردانہ ایست از بحر معرفت در سلک نظم کشیدہ و بغایت مطبوع آمدہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کتابوں کا بڑا شوقین[۱] اور خود ایک مشہور فاضل تھا[۲]۔ اس نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا تھا اس کے اندر ریاضی و ہیئت اور جغرافیہ کی تعلیم کا خاص انتظام تھا اور یہ وہ مضامین تھے، جن کے اندر وہ بذات خود دلچسپی رکھتا تھا۔ اس مدرسہ کے ایک مشہور استاد شیخ حسین تھے[۳]۔

(۹) اکبر اعظم اور اس کے تعلیمی نظریات و اصلاحات

یہ صحیح ہے کہ ترک اور افغان پیشرووں کی طرح مغلوں کے یہاں بھی تعلیم کا کوئی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) وواقعات خود را از ابتدائے سلطنت تا ارتحال از قرار واقع بعبارت فصیح و بلیغ نوشتہ اند کہ دستور العمل است بجہت فرمانروایان عالم و قانونے است در آموختن اندیشہائے درست و فکر صحیح برائے تجربت پذیران و دانش آموزان روزگار۔۔۔۔ و آنحضرت در فن موسیقی نیز دستگاہ والا داشتند و ہم چنیں بزبان فارسی نیز اشعار دل پذیر دارند۔۔۔ و آنحضرت را در عروض رسائل شریف است و از آنجملہ کتابے است مفصل کہ شرح فن تواند بود" (اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۱۱۹) اسی طرح بدایونی ہمایوں کے بارے میں لکھتا ہے:

"بجمیع فضائل و کمالات صوری و معنوی آراستہ و در علوم ہیئت و نجوم و سایر علوم غریبہ بے نظیر و مربی اہل فضل و کمال و مرجع اہل تقویٰ و صلاح و بشعر شعرا مائل و خود شعر نیکو گفتے" (منتخب التواریخ مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۱۲۰)

[۱] جب بابر نے ۹۳۲ھ میں قلعہ ملوٹ کو فتح کیا تو غازی خاں کا کتب خانہ بھی مال غنیمت میں آیا۔ بابر نے اس کا بڑا حصہ ہمایوں کو عطا کیا، چنانچہ ابو الفضل لکھتا ہے:۔

"قلعہ ملوٹ بدست اولیائے دولت قاہرہ مفتوح شد۔۔۔ و کتابہائے غازی خان کہ درین قلعہ بود آوردند۔ بعضے را بحضرت جہانبانی مکرمت فرمودند" (اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۹۴)

لشکر کشی کے موقعہ پر بھی کتب خانہ ہمایوں کے ہمراہ رہتا تھا، چنانچہ ابو الفضل دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

"و اکثر کتب نفیسہ کہ مصاحبان معنوی بودند و پیوستہ با خود داشتند" (اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۲۳۶)

[۲] کمالات صوری و معنوی و مآثر عقل و دانش ایں یگانۂ روزگار بیش از آن است کہ بتحریر آید۔ از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام داشتند علی الخصوص در اقسام علوم ریاضی آنحضرت را پایۂ بلند بود" (اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۶۸)

[۳] اس مدرسہ کے دو استاد مشہور تھے۔ شیخ حسین بزبیری اور مولانا اسمٰعیل عرب۔ بدایونی نے ان کے بارے میں لکھا ہے (منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۳۰)

شیخ حسین بزبیری از اعلام اعیان در مدرسہ حضرت دہلی بافادہ طلاب مشغول می بود (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

مستقل محکمہ نہ تھا، نہ تو مرکزی حکومت میں اور نہ صوبائی حکومتوں میں۔ لیکن بادشاہ اور اُمراء بغیر کسی استثناء کے علم وادب کی سرپرستی سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے[1]

اکبر کو عوام کی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے ابتدائی مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم میں اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اُس کے ایماء سے بعض مضامین جیسے منطق، حساب، مساحت، ہندسہ، ہیئت، سیاق واستیفا، سیاست مدن اور فلاحت نصاب تعلیم میں داخل کئے گئے[2] اس تجویز سے ملک کے تعلیمی نظام میں لادینی رجحان پیدا ہوگیا[3]

اکبر اگرچہ خود اُمی محض تھا، پھر بھی اس نے بچوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے باب

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) ..... مولانا اسمٰعیل عرب از اقران شیخ حسین و امثال ایشاں بود و در ہیئت وحکمت وطب بے نظیر بود و در درس شرکت مکانی با شیخ حسین داشت"

[1] علم وادب کی سرپرستی ہمیشہ سے مسلمانوں میں لوازم جہانداری میں سے سمجھی گئی ہے۔ محمد غوری کے متعلق "تاج المآثر" کی تصریح مذکور ہو چکی ہے کہ فتح اجمیر کے بعد اُس نے وہاں مدارس قائم کئے۔ اسی طرح جب بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا تو بقول منہاج سراج وہاں مدارس قائم کئے۔ "چوں محمد بختیار آں مملکت را ضبط کرد..... مساجد ومدارس وخانقاہات دراں اطراف بسعی جمیل او وامرائے او بنا شد" (طبقات ناصری صفحہ ۱۵۱)

یہی رسم بعد میں جاری رہی۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ محض رزم آرائیوں ہی کا افسانہ نہیں ہے، بلکہ علم وادب کی سرپرستی کی مسلسل داستان ہے۔

[2] "و حکم شد کہ اہلیان از علوم غیر نجوم وحساب وطب وفلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نہ کنند" (دبستان المذاہب صفحہ ۳۲۰)

لیکن بدایونی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف دین الٰہی کے پیرؤوں کے لئے بلکہ سبھی کیلئے یہ حکم تھا:- "و دریں سال حکم شد کہ ہر قوم ترک علوم عربیہ نمودند غیر از نجوم وحساب وطب وفلسفہ نخوانند۔ و کساد فضل تاریخ یافتہ شد" (منتخب التواریخ مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۲۶۱)

[3] و بشنیدن مناظرۂ علماء درمیان، مردم بالطبع خواندن تفسیر وفقہ برطرف شد (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اپنے ایک مقولے میں اس نے اس محبت کا اظہار جو اُسے بچوں کے ساتھ تھی، بدیں طور کیا تھا۔

"بچے چمنستان وجود کی نازک کلیاں ہیں۔ اُن سے محبت کر کے ہم گویا خالق کی تحمید و توصیف کرتے ہیں"۔ ؎

آئین اکبری جلد دوم کا پچیسواں آئین بچوں کی ابتدائی تعلیم کی تنظیم پر مشتمل ہے۔ یہ آئین حسب ذیل ہے:-

"ہر ملک میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً بچوں کو سالہا سال تک مدرسوں میں صرف اس لئے رکھا جاتا ہے کہ وہ حروف صحیح اور حروف علت سیکھتے رہیں۔ بچوں کی عمر کا بڑا حصہ بہت سی کتابوں کے پڑھنے میں ضائع ہوتا ہے۔ بادشاہ سلامت کا حکم ہے کہ ہر ایک بچہ پہلے حروف کا لکھنا سیکھے۔ نیز ان کی مختلف شکلوں کی تحریر سیکھے۔ انہیں ہر حرف کی شکل اور اُس کا نام سیکھنا چاہیے۔ یہ کام دو دن میں ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد بچے کو حروف موصولہ کی تحریر سیکھنا چاہیے۔ اس کی ایک ہفتہ مشق کی جائے۔ بعد ازاں کچھ منثور عبارتیں اور کچھ منظوم ابیات و اشعار حفظ کرنا چاہئیں۔ پھر کچھ حمد کے اشعار یا اخلاقی اشعار علیحدہ علیحدہ لکھ کر زبانی یاد کرنا چاہئیں۔ اس بات کی احتیاط کرنا چاہئے کہ بچہ ہر چیز کو خود سمجھنا سیکھے۔ البتہ بوقت ضرورت استاد بھی اُس کی اعانت کر سکتا ہے۔ اس کے بعد آسے روزانہ ایک مصرعہ یا ایک بیت لکھنے کی مشق کرنا چاہیے۔ اس طرح اس کا ہاتھ رواں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) ... و نجوم و حکمت حساب و تصوف و شعر و تاریخ مقرر گشت " دبستان المذاہب ۳۲۷)

؎ "می فرمودند: خردسالان نورسان تخم زار ہستی اند بایشاں گرائیدن بداد ارجان آفریں وفتہ در دن است" (آئین اکبری مطبوعہ نولکشور پریس جلد سوم دفتر پنجم صفحہ ۱۰۲)